م میں عدلِ اجتماعی

اہمیت ، اور موجودہ

اور غیر حاضر زمی

کے خاتمے کی صورت!

اکٹر اسرار احمد

اسلام میں عدلِ اجتماعی

کی اہمیت ' اور موجودہ

جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 03-5869501

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

اسلام محض ایک مذہب نہیں دین ہے۔ یہ محض انسان اور رب کے پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں' ایک مکمل ضابطۂ حیات اور کامل اجتماعی نظام کا نام ہے' جس میں ''عدل اجتماعی'' کو ماٹو کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن مجید میں اس کے لئے ''دین حق'' اور ''المیزان'' کے الفاظ آئے ہیں۔ اور یہ بات نہایت قابل توجہ ہے کہ رسولوں کو مبعوث فرمانے اور آسمانی کتابوں کو نازل کرنے کا اصل مقصد ''قیام نظام عدل اجتماعی'' قرار دیا گیا ہے۔ (بحوالہ سورہ حدید آیت نمبر ۲۵)

رفقاء و احباب جانتے ہیں کہ مرکزی انجمن کے صدر مؤسس اور تنظیم اسلامی کے امیر' جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے دروس و خطاب میں مذکورہ بالا نکتے کو خصوصیت کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں اور اسلام کے نظام عدل اجتماعی کا تصور توحید کے ساتھ جو گہرا رشتہ ہے جس کی طرف علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اشارات کئے ہیں' اسے نہایت خوبصورتی اور وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ معاشی عدل کے ضمن میں جہاں نقد کے سود یعنی ''ربا'' کی بھرپور مذمت ان کے خطابات میں ملتی ہے وہاں جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کے بارے میں ان کی رائے ان علماء کرام کی رائے کے ساتھ ہم آہنگ ہے جن کے نزدیک یہ دراصل ''زمین کا سود'' ہے جو معاشی استحصال کی بدترین صورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد طاسین صاحب مرحوم (سابق صدر مجلس علمی کراچی) کی کتاب ''مروجہ نظام زمینداری اور اسلام'' کو محترم ڈاکٹر صاحب نے نہایت اہتمام سے شائع کیا اور علماء کرام کو اس پر غور و فکر کی دعوت دی۔

آج سے قریباً آٹھ سال قبل جب محترم ڈاکٹر صاحب کوادارہ نوائے وقت کی جانب سے ہفتہ وار اخباری کالم ''تفکر و تدبر'' کے اجراء کی دعوت ملی تو انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہاں انہوں نے بعض دیگر دینی و مذہبی اور ملی و سیاسی موضوعات پر قلم اٹھایا وہاں اسلام میں عدل اجتماعی کی اہمیت اور موجودہ جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کے خاتمے کی صورت پر بھی جامعیت اور عمدگی کے ساتھ روشنی ڈالی۔ اس ضمن میں محترم ڈاکٹر صاحب کی چار تحریروں کو جن کا تعلق موضوع زیرِ بحث سے ہے' یکجا طور پر کتابچے کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

حافظ عاکف سعید
ناظم شعبہ نشر و اشاعت
۱۳/اپریل ۲۰۰۱ء

باب اول

اسلام اور سماجی انصاف

ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کی اعلیٰ ترین قدر' اس کا آخری ہدف' اور اصل مقصود و مطلوب عدلِ اجتماعی یعنی سماجی انصاف یا سوشل جسٹس ہے جس کے تین نمایاں ترین مظاہر ہیں: (۱) سماجی اور قانونی سطح پر کامل مساوات (۲) سیاسی سطح پر حریت اور (۳) معاشی سطح پر عدل و انصاف۔ چنانچہ اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں نہ معاشرتی میدان میں اونچ نیچ اور ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز ہو' نہ سیاسی میدان میں جبر و استعداد کا راج اور بندہ و آقا' حاکم و محکوم اور مستکبرین اور مستضعفین کی تقسیم ہو' نہ اقتصادی میدان میں انسان ظلم اور استحصال کے باعث Haves اور Have nots یعنی مترفین و محرومین میں منقسم ہوں!

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات کو خیال آئے کہ اسلام کی اعلیٰ ترین قدر تو تقرب الی اللہ اور تعلق مع اللہ یعنی بندہ اور رب کے مابین خلوص و اخلاص اور باہمی محبت و ولایت کا رشتہ ہے! تو اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ واقعہ یہی ہے کہ اسلام انفرادی سطح پر بندۂ مومن کو جو بلند ترین نصب العین عطا کرتا ہے وہ رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول ہے' لیکن اس حقیقت سے صرفِ نظر کر لینا بھی شدید قسم کی بے حسی اور ناانصافی ہو گی کہ جس خطۂ ارضی میں نظامِ اجتماعی ظالمانہ اور استحصالی ہو وہاں کے لوگوں کی عظیم اکثریت کولہو کے بیلوں اور بار برداری کے جانوروں کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور فرمانِ نبوی ﷺ ((کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا)) یعنی "قریب ہے کہ فقر و احتیاج کفر کی صورت اختیار کر لیں!" اور قولِ شاعر ؎

"دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے!"

کے مصداق ان میں نہ اتنا شعور باقی رہ جاتا ہے کہ اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کر سکیں، نہ اتنی فرصت ہی حاصل ہوتی ہے کہ ع ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے!'' کے مصداق اسے یاد کر سکیں یا اس سے لو لگا سکیں! اس سلسلے میں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا یہ قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل اور لوحِ قلب و ذہن پر نقش کر لینے کا مستحق ہے کہ تقسیم دولت کا غیر منصفانہ نظام ایک دو دھاری تلوار ہے جو معاشرے کو دونوں جانب سے کاٹتی ہے، کیونکہ اس کے نتیجے میں ایک جانب ایک محدود طبقے میں دولت کا ارتکاز ہو جاتا ہے جس سے عیاشی اور بداخلاقی جنم لیتی ہے، اور دوسری جانب فقر و احتیاج کا دَور دَورہ ہو جاتا ہے جس سے انسان ڈھور ڈنگر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں! بنا بریں خانقاہی نظام کے برعکس، جو مجاہدۂ نفس اور ریاضت و مراقبہ ہی کو مقصود و مطلوب بنا لیتا ہے، اسلام نے اپنا ''ذروۂ سنام'' یعنی چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ کو قرار دیا ہے جس کا اصل ہدف ہے: قیامِ عدلِ اجتماعی اور ظلم و جبر اور استحصال اور استبداد کا خاتمہ!

اسلام میں اس عدلِ اجتماعی یا سماجی انصاف یعنی سوشل جسٹس کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس مسئلے میں قرآن حکیم کی عام تعلیمات پر مستزاد اِن تصریحات کے جائزہ سے آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو تین بلند ترین سطحوں یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور امت مسلمہ کے فرائض منصبی کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔

(۱) اسلام کی اصل اساس ایمان باللہ ہے، اور ایمان باللہ اور معرفت الٰہی کا واحد ذریعہ اللہ کے اسماء و صفات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماءِ حسنیٰ کی تفصیل پر مشتمل جو حدیث امام ترمذیؒ اور امام بیہقیؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا ایک نامِ نامی اور اسمِ گرامی ''العدل'' بھی ہے، یعنی سراپا عدل اور مجسم انصاف۔ قرآن حکیم میں اگرچہ اللہ تعالیٰ کا یہ نام تو وارد نہیں ہوا، تاہم متعدد مقامات پر اس کی اس شان کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً:

﴿وَاللّٰہُ یَقۡضِیۡ بِالۡحَقِّ﴾ (المومن: ۲۰)

''اور اللہ فیصلہ کرتا ہے حق کے ساتھ۔''

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا﴾ (الانعام: ۱۱۵)

''تیرے رب کی بات صدق و عدل کے جملہ معیارات کے مطابق پوری ہو چکی ہے۔''

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾

(آل عمران: ۱۸)

''خود اللہ بھی گواہ ہے اور سب فرشتے اور تمام اہل علم بھی گواہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو عدل و انصاف کو قائم کرنے والا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (المائدۃ' الحجرات اور الممتحنہ)

''اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

(۲) ایمان باللہ کے بعد درجہ اور مرتبہ ہے ایمان بالرسالت یعنی بعثت انبیاء و رُسل اور انزالِ کتاب و شریعت پر یقین کا۔ چنانچہ یہ بات بھی قرآنِ حکیم نے نہایت واشگاف الفاظ میں واضح کر دی ہے کہ ان جملہ امور کا اصل مقصد یہ ہے کہ ''انسان عدل و انصاف پر قائم ہوں۔''

اس اہم موضوع پر قرآنِ حکیم کی سب سے زیادہ ''انقلابی آیت'' سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ ہے جس کے بارے میں بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنے مختصر الفاظ میں اس قدر جامع اور اتنی بھرپور اور گھمبیر انقلابی عبارت کی کوئی دوسری مثال دنیا کے پورے انقلابی لٹریچر میں کہیں نہیں مل سکتی۔

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾

اس آیۂ مبارکہ کا ترجمہ بعض تشریحی اضافوں کے ساتھ یوں ہوگا:

''یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں (یعنی معجزات و براہین) کے ساتھ

بھیجا اور ان کے ساتھ اپنی کتاب بھی نازل فرمائی اور میزان بھی' تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں' اور (جو لوگ اس میزانِ عدل کے نصب کرنے میں رکاوٹ بنیں' ان کی سرکوبی کے لئے) ہم نے لوہا اتارا جس میں (حرب وضرب) کی شدید قوت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے لئے (کچھ دوسرے) فائدے بھی ہیں۔ اور (اس سے اللہ کا اصل مقصد یہ ہے) کہ اللہ (ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو آزمائے اور یہ) دیکھے کہ کون ہیں جو (لوہے کی حربی قوت کے استعمال کے ذریعے) مدد کرتے ہیں اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں ہوتے ہوئے' (ورنہ) یقیناً اللہ (خود) نہایت زور آور اور مختار مطلق ہے!''

اس آیۂ مبارکہ نے نہایت واشگاف الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ:

اولاً: شریعت خداوندی کی اصل حیثیت ایک میزانِ عدل وقسط کی ہے جس میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی حقوق وفرائض تولے جانے چاہئیں۔

ثانیاً: بعثت انبیاء ورسل اور نزولِ وحی وکتب سے آخری مطلوب یہ ہے کہ اللہ کی عطا کردہ میزانِ عدل وقسط بالفعل نصب ہو اور جسے کچھ ملے اس میں تل کر ملے اور جس سے کچھ لیا جائے اس میں تول کر لیا جائے۔ اور اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو ع ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!'' کے مصداق رسولوں کے ساتھ عشق ومحبت کے دعوے باطل اور کتابِ الٰہی کی تلاوت وقراءت کا ذوق وشوق بے مقصد ہو جاتا ہے۔

ثالثاً: اس میزانِ عدل وقسط کو عملاً نصب کرنے کے ضمن میں جہاں اصل کام دعوت وتبلیغ' وعظ وتلقین' انذار وتبشیر اور ترغیب وترہیب سے لیا جائے گا وہاں قوت وطاقت کا استعمال بھی قطعاً غلط یا مطلقاً ناجائز نہیں' بلکہ حسبِ ضرورت نہ صرف جائز بلکہ بعض صورتوں میں فرض اور واجب ہو جاتا ہے۔

رابعاً: جس طرح انسان کی حیاتِ دُنیوی کا اصل مقصد از روئے قرآن ابتلاء وآزمائش ہے' جیسے کہ وارد ہوا سورۃ الملک کی آیت نمبر ۲ میں جس کی ترجمانی کی ہے ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے اپنے اس حکیمانہ شعر میں کہ ؎

''قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی!''

اسی طرح انبیاء و رُسل کی بعثت اور کتاب و شریعت کے نزول کا مقصد اُن لوگوں کے خلوص اور صداقت کا امتحان ہے جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان کے دعوے دار ہوں کہ آیا وہ اللہ کی عطا کردہ میزانِ عدل کو بالفعل نصب کرنے اور اسلام کے نظامِ عدل و قسط کو عملاً قائم کرنے میں تن من دھن کھپاتے' حتیٰ کہ وقت آنے پر نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ جاتے ہیں یا نہیں!

خامساً: وہ صاحب ایمان جو اِس امتحان میں پورا اتریں اللہ کے نزدیک بلند ترین مقام و مرتبہ کے مستحق ہوں گے' یہاں تک کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے ''مددگار'' قرار پائیں گے۔

قرآن حکیم کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس کتابِ عزیز کا ایک مستقل اصول یہ ہے کہ اس میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ الحدید کی اس آیت ۲۵ کی طرح سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۷ میں بھی کتاب و میزان کا ذکر یکجا وارد ہوا ہے: ﴿اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ﴾ یعنی ''اللہ وہ ہے جس نے کتاب بھی حق کے ساتھ نازل فرمائی اور میزان بھی!'' اور اس سے قبل آیت ۱۵ میں نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے ع ''مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ'' کے انداز میں کہلوایا گیا ہے کہ ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ﴾ یعنی ''مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں!''...اسی طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نصرت کا ذکر جس انداز میں سورۃ الحدید کی اس آیت کے آخر میں آیا ہے' بالکل اسی طرح سورۃ الصف کی آخری آیت میں بھی وارد ہوا ہے۔ یعنی:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾

''اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو جیسے کہ عیسٰی ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟ تو حواریوں نے جواب دیا تھا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار!''

مزید برآں یہ حقیقت بھی ذہن میں مستحضر کر لیجئے کہ سورۃ الصف کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت یہ بیان ہوا ہے کہ جو دین حق یعنی نظامِ عدل وقسط آپؐ کو دے کر بھیجا گیا ہے اسے پورے نظامِ زندگی پر بالفعل قائم کر دیں۔

(۳) نبی اکرم ﷺ پر نبوّت کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد اب قیامت تک رسالت کے مشن کی تکمیل اور فرائض رسالت کی ادائیگی کی ذمہ داری امت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہو گئی ہے۔ اس کے ضمن میں قرآن حکیم میں جہاں سورۃ الحج کی آخری آیت اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں ''شہادت علی الناس'' کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے' اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۴ اور ۱۱۰ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ وارد ہوئے ہیں وہاں سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۸ میں ذرا سی لفظی ترتیب کے فرق کے ساتھ عدل وقسط کی گواہی اور نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنے کے لئے پوری قوّت کے ساتھ کھڑے ہو جانے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ...﴾

''اے اہل ایمان! پوری قوّت کے ساتھ عدل وقسط کے قائم کرنے والے اور اللہ کے حق میں گواہی دینے والے بنو' خواہ یہ گواہی تمہارے اپنے خلاف جا رہی ہو''

اور سورۃ المائدۃ میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾

''اے ایمان والو! پوری قوّت کے ساتھ اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ عدل وقسط

کی گواہی دیتے ہوئے' اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم عدل سے انحراف کرو ہر حال میں عدل سے کام لو' یہی تقویٰ سے قریب تر ہے!''

(۴) اس مضمون کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ قرآن مظلوم اور محروم طبقات کو صرف صبر ہی کی تلقین نہیں کرتا بلکہ انتقام لینے کی اجازت بھی دیتا ہے۔ چنانچہ انفرادی سطح پر تو سورۃ النساء کی آیت ۱۴۸ کے یہ الفاظ کفایت کرتے ہیں کہ:

﴿لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾

''اللہ کو بری بات بلند آواز سے کہنا بالکل پسند نہیں' سوائے اس کے جس پر ظلم ہوا ہو!''

اور اجتماعی سطح پر یہ بات نہایت واشگاف الفاظ میں فرمائی گئی ہے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۹ میں' جہاں ایسے لوگوں کا ذکر مدح وستائش کے انداز میں کیا گیا ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ﴾

''جن پر ظلم اور زیادتی کی جائے تو وہ اس کا بدلہ اور انتقام لیتے ہیں۔''

اور پھر آیات ۴۱ اور ۴۲ میں مزید تصریح کی گئی ہے کہ:

﴿وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ o اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ o﴾

''جو کوئی انتقام لیتا ہے اس کے بعد کہ اس پر ظلم کیا گیا ہو تو ایسے لوگوں پر نہ کوئی الزام ہے نہ ملامت' الزام اور ملامت کے قابل تو وہ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں (یعنی ان کے سماجی' سیاسی اور معاشی حقوق غصب کرتے ہیں) اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں (مستکبرین اور مترفین کی صورت اختیار کر لیتے ہیں) ایسے ہی لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے!''

ان اختتامی الفاظ میں گویا کہ اشارہ موجود ہے کہ ان ظالموں اور مستکبرین کو آخرت میں تو سزا ملے گی ہی' دُنیا میں بھی نہ صرف یہ کہ ان کے ہاتھ روکنے کی بھرپور سعی ہونی

چاہئے بلکہ ضرورت پیش آئے تو سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۹ میں وارد شدہ الفاظ ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ یعنی ''اے ہوش مندو! تمہارے لئے قصاص ہی میں زندگی ہے!'' کے مطابق ایسے لوگوں کو بھر پور سزا دینے کی خُنی کہ ان کی سرکوبی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جانا چاہئے!

حاصل کلام یہ ہے کہ بحیثیت دین' اسلام کی اعلیٰ ترین قدر سماجی اور تمدنی انصاف ہے اور اقامت دین یعنی اسلامی انقلاب کا اصل ہدف یہ ہے کہ اللہ کا عطا کردہ متوازن اور معتدل نظامِ عدلِ اجتماعی (سسٹم آف سوشل جسٹس) قائم کیا جائے۔

آخر میں عربی زبان کے اس مقولے کے مطابق کہ ''اَلْفَضْلُ شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ'' یعنی ''اصل فضیلت اور خوبی وہ ہے جس کا اعتراف دشمن بھی کریں'' ایک شاتم رسولؐ کی گواہی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری مراد ایچ جی ویلز سے ہے جس نے نبی اکرم ﷺ کی ذاتی اور ازدواجی زندگی پر نہایت رکیک حملے کئے ہیں' لیکن اس نے بھی اپنے آپ کو اس عدل اجتماعی کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں شاندار ہدیۂ تحسین پیش کرنے پر مجبور پایا۔ چنانچہ اپنی تالیف "A Concise History of the World" میں آنحضور ﷺ کے خطبہ حجتہ الوداع کے کچھ حصے نقل کرنے کے بعد اس نے لکھا:

> ''انسانی حریت' اخوت اور مساوات کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے' چنانچہ مسیح ناصری کے یہاں بھی وہ بکثرت موجود ہیں' لیکن اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ان اصولوں پر بالفعل ایک معاشرہ تاریخ انسانی میں پہلی بار قائم کیا محمد (ﷺ) نے''۔

(نوٹ: ایچ جی ویلز کی یہ عبارت اس کتاب کے نئے ایڈیٹروں نے تازہ ایڈیشن سے حذف کر دی ہے' لیکن بڑی لائبریریوں میں وہ پرانے ایڈیشن دستیاب ہیں جن میں یہ الفاظ موجود ہیں!)

ساتھ ہی شدید حسرت کے ساتھ یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جا رہا کہ معمارِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے بھی حصول پاکستان کے اصل مقصد کی وضاحت کے لئے یہی

الفاظ استعمال کئے تھے کہ: ''ہم پاکستان اس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ عہد حاضر میں اسلام کے اصول حریت واخوت ومساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں''۔اور ۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد میں مصورِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اپنی اس پیشینگوئی کے ساتھ کہ ''ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام تقدیرِ الٰہی ہے'' یہی فرمایا تھا کہ ''اگر ایسا ہوگیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کے چہرۂ روشن پر جو پردے عرب ملوکیت کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اسلام کا اصل روئے انور دنیا کو دکھا سکیں!''...

لیکن افسوس صد افسوس' کہ قیامِ پاکستان کے ساڑھے ترپن سال بعد بھی ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ ہے اور اس سمت میں کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکی...کاش! اے کاش! کہ ع ''کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!'' کے مصداق ملت اسلامیہ پاکستان اب بھی اپنے اصل ہدف کی طرف بڑھنے کا عزم مصمم کرلے...آمین! وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ!

باب دوم
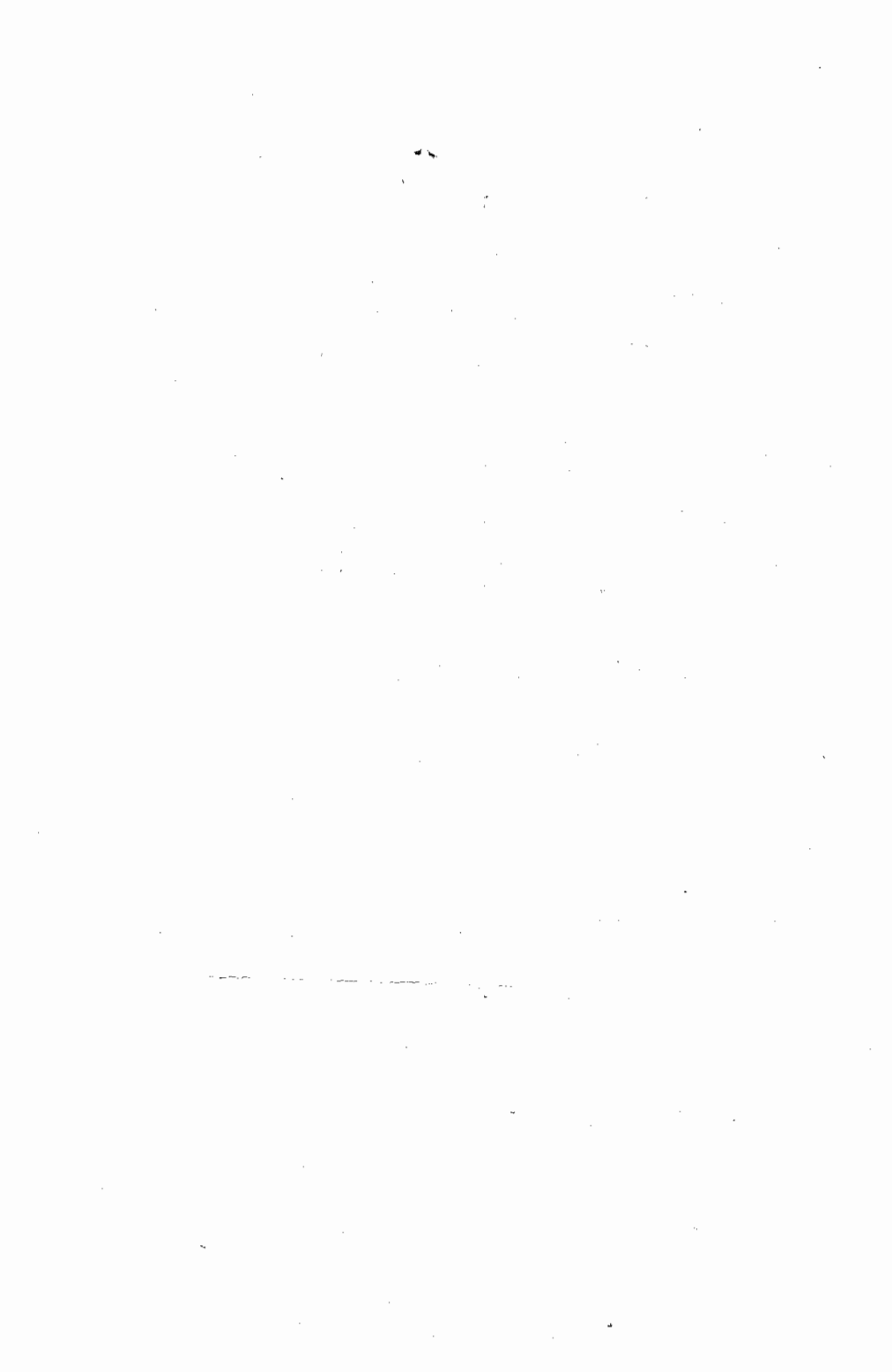
پاکستان میں سماجی انصاف کا اولین تقاضا

ایک نیا اور منصفانہ بندوبست اراضی

جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' سماجی انصاف کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس کے متعدد پہلو ہیں' جن کے اپنے اپنے جداگانہ تقاضے ہیں۔

مثلاً خالص سماجی اور معاشرتی سطح پر انصاف کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ تمام انسانوں کو پیدائشی طور پر مساوی تسلیم کیا جائے اور ان کے مابین اونچ نیچ کا کوئی فرق اور اعلیٰ و ادنیٰ کا کوئی امتیاز اُن چیزوں کی بنیاد پر نہ ہو جو انہیں پیدائشی طور پر ملتی ہیں' لہٰذا ان کے ضمن میں کسی انتخاب و اختیار یا کسب و سعی کا سوال نہیں ہوتا' جیسے نسل' رنگ اور جنس۔ گویا انسانوں کے مابین کوئی فرق و تفاوت اور درجہ بندی صرف ان امور کی بنیاد پر ہو سکتی ہے جن میں اُن کے کسب و اختیار اور سعی و جہد کو دخل حاصل ہے' جیسے نظریات و عقائد' یا سیرت و کردار' یا علم و ہنر وغیرہ۔ پھر یہ درجہ بندی بھی خالص انتظامی حیثیت کی حامل ہو گی' شرفِ انسانیت کو پوری نوعِ انسانی کی مشترکہ اور مساویانہ متاع کی حیثیت حاصل رہے گی' اور اس اعتبار سے تمام انسان ہر صورت میں بالکل مساوی اور برابر متصور ہوں گے!

اسی طرح سیاسی سطح پر سماجی انصاف کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان کو بنیادی طور پر آزاد تسلیم کیا جائے۔ جیسے کہ امیر المؤمنین اور خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ نے ایران کے فاتح اور گورنر حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کو مکان کے آگے ڈیوڑھی بنانے اور دربان کھڑا کرنے پر سرزنش کے طور پر تحریر فرمایا تھا: ''اے سعدؓ! لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا' تم نے انہیں اپنا غلام کب سے بنا لیا؟'' ---- پھر اسی اصول کا ایک

کامل انصاف کے یہ دونوں پہلو جو اوپر بیان ہوئے نہایت اہم ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل بنیادی حیثیت اور اساسی اہمیت ان ہی کو حاصل ہے۔ مزید برآں ''مساوات'' کے لفظ کا صحیح اور کامل اطلاق بھی صرف ان ہی دونوں سطحوں پر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عہدِ حاضر میں ان دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی ہے اور مشین کی ایجاد کے بعد سماجی انصاف کے ضمن میں اوّلین اہمیت معاشی عدل اور اقتصادی انصاف کو حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ تاریخ انسانی کے موجودہ دَور کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اصلاً معاشیات اور اقتصادیات کا دَور ہے' اور عہدِ حاضر کا انسان فی الواقع ''معاشی حیوان'' بلکہ صحیح تر الفاظ میں مشین کے مانند صرف ایک ''ذریعۂ پیداوار'' بن کر رہ گیا ہے۔ یہاں تک کہ آج عظیم ترین سلطنتوں اور ''سپر پاورز'' کا درجہ رکھنے والی حکومتوں کی بلند ترین سطح کی پالیسیاں بھی بنیادی طور پر معاشی مفادات اور اقتصادی مصلحتوں ہی کی بنیاد پر طے ہوتی ہیں---- لہٰذا عہدِ حاضر میں سماجی انصاف کا اوّلین اور اہم ترین تقاضا معاشی عدل اور اقتصادی انصاف ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی معاشرے میں معاشی عدل و قسط کا فقدان ہو' اور اقتصادی میدان میں ظلم اور استحصال کی بھٹی گرم ہو' اور انسان قرآن کی اصطلاح میں

''مترفین'' اور ''محرومین'' کے طبقات میں تقسیم ہو کر رہ گئے ہوں تو وہاں خواہ ''حریت' اخوت اور مساوات'' کے کتنے ہی راگ الاپے جائیں یا وعظ کہے جائیں' اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر جمہوریت کے کیسے ہی سوانگ رچا لئے جائیں' حقیقت کے اعتبار سے وہاں کا پورا اجتماعی نظام ''مراعات یافتہ طبقات کی آمریت'' کی صورت اختیار کر لے گا اور سماجی و معاشرتی اور سیاسی و ریاستی انصاف کے تمام دعوے باطل اور کھوکھلے قرار پائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ ترجمان حقیقت علامہ اقبال مرحوم نے مغربی جمہوریت کا تجزیہ یا پوسٹ مارٹم ان تیکھے ہی نہیں تلخ الفاظ میں کیا ہے ۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن' اندروں چنگیز سے تاریک تر!

اور ۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اور واقعہ یہ ہے کہ یہ الفاظ نہ محض لفاظی کے مظہر ہیں نہ مبالغہ آرائی کے -- بلکہ ۔

اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

کے مصداق صد فی صد حقیقت بینی اور صدق بیانی پر مبنی ہیں۔ اس لئے کہ وہاں سرمایہ دارانہ معیشت اور سود' جوئے اور سٹے پر مبنی اقتصادی نظام نے کروڑ پتی اور ارب پتی سرمایہ داروں کا ایک محدود طبقہ پیدا کر دیا ہے اور ملکی سیاست ان کی زر خرید لونڈی بن کر رہ گئی ہے۔ یا بالفاظ دیگر اس نے اس محدود طبقے کے مشغلے اور فٹ بال یا والی بال کے سے کھیل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ یہ وہ مکروہ اور گھناؤنی حقیقت ہے جس پر ''بنیادی انسانی حقوق'' اور ''حقوقِ شہریت'' کا رنگ و روغن مَل دیا گیا ہے' اور حریت

فکر و عمل، آزادیٔ اظہار رائے اور بالغ رائے دہی پر مبنی ''جمہوریت'' کے حسین نقش و نگار بنا دیئے گئے ہیں!

چنانچہ اسی گندم نمائی اور جو فروشی کا ردِ عمل تھا جو کمیونزم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن چونکہ اس نے ''ردِ عمل'' کی فطری انتہا پسندی کے جوش میں انفرادی ملکیت کی کامل نفی کر دی جس سے انسان کی حیوانی جبلت کے ایک اہم تقاضے کی نفی ہو گئی، لہٰذا وہ بہت جلد ناکام ہو کر ع ''خوش درخشید، ولے شعلۂ مستعجل بود!'' کی نمایاں مثال بن کر رہ گیا۔ اس لئے کہ شیخ سعدیؒ کے اس قول کے مطابق کہ ؎

''آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ و ز حیوان!''

انسانی شخصیت میں جہاں ایک فرشتہ خصلت روحانی عنصر بھی شامل ہے، وہاں جملہ حیوانی جبلتوں کا حامل ''حیوان کامل'' بھی موجود ہے، جس کے کسی اساسی تقاضے کی کلی نفی فطرت سے انحراف کے مترادف ہے، جس میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں! بہرحال کمیونزم کی اس شکست کے نتیجے میں اس وقت مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت کا عفریت فاتحانہ انداز کی شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ نیو ورلڈ آرڈر کی صورت میں عالمی غلبے کے ذریعے پورے عالم انسانی کو اپنے استحصالی جال میں جکڑنے کے لئے فیصلہ کن اقدام کے لئے پر تول رہا ہے! اور اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ بالآخر تو ''جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ'' کی الٰہی تقدیر اور خدائی فیصلے ہی کا ظہور ہوگا اور تمام روئے ارضی پر ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کا نظام عدل و قسط ہی قائم ہوگا۔ تاہم فی الوقت پوری دنیا میں ایسی کوئی طاقت نظر نہیں آ رہی جو اِس شیطانی منصوبے کی راہ میں فیصلہ کن طور پر مزاحم ہو سکے۔ لیکن چونکہ علامہ اقبال کی ''اطلاع'' کے مطابق تو اب سے نصف صدی قبل ہی ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کی قرارداد یہ تھی کہ ؎

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے　　مزدکیت فتنہ فردا نہیں، اسلام ہے!

لہٰذا اس کے باوجود کہ ابھی پوری زمین کے کسی ایک انچ رقبے پر بھی کہیں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی نہیں ہو سکا' اور سماجی انصاف کا اسلامی تصور تا حال ''مسلمانی در کتاب'' کے مصداق یا تو صرف طاق تصور و تخیل کی زینت ہے' یا زیادہ سے زیادہ صرف لکھے ہوئے یا بولے ہوئے حروف و الفاظ کی صورت میں موجود ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ کے شیطانی آلہ ہائے نشر و اشاعت نے حفظ ماتقدم کے طور پر ''اسلامک فنڈامنٹلزم'' کی دہائی نہایت زور و شور کے ساتھ دے رکھی ہے جس کے متوقع یا ''قابل حذر'' مراکز کی فہرست میں پاکستان کا نام بھی شامل ہے! (اور اگرچہ پاکستان کے عام انتخابات کے نتائج سے عالمی شیطانی قوتوں کو کم از کم وقتی طور پر کچھ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے' تاہم جو لوگ ''باطن ایام'' پر نگاہ رکھتے ہیں' اور ع ''سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف!'' کے مصداق قرآن حکیم اور احادیث رسول اللہ ﷺ کی دو آنکھوں سے حقائق باطنی کو دیکھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں' وہ جانتے ہیں کہ ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کی صورت میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی یعنی سماجی انصاف کے کامل اور متوازن نظام کے قیام کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت ان شاء اللہ اسی سلطنت خداداد پاکستان اور اس سے ملحق سرزمین افغانستان کو حاصل ہو گی جسے دورِ نبویؐ میں خراسان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ واللہ اعلم !!!)

بہر حال اسی عالمی تناظر کے پیش نظر اور اس زمان و مکان کے فریم ورک کے پس منظر میں پاکستان کے معروضی حالات کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا جائے تو یہ حقیقت کبریٰ فوری طور پر اظہر من الشمس کی طرح سامنے آتی ہے کہ اگرچہ مغربی سرمایہ دارانہ معیشت اور سود' جوئے اور سٹے کے تانے بانے والا مغربی اقتصادی نظام بھی ہمارے ملک میں بدترین اور مکروہ ترین صورت میں رائج ہے' جس کے نتیجے میں یہاں بھی چند ہزار خاندان ایسے وجود میں آ چکے ہیں جن پر قرآنی اصطلاح ''مترفین'' کا اطلاق کیا جا سکتا ہے' جو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۶ و ۲۷ کے مطابق فسق و فجور' اسراف و تبذیر اور

عیاشی و فحاشی کی صورت میں اپنا روایتی کردار ''باحسن وجوہ'' ادا کر رہے ہیں (یعنی: ''جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اس کے مترفین کو چھوٹ دے دیتے ہیں کہ اس میں فسق و فجور کا بازار گرم کر دیں۔ اس کے نتیجے میں وہ بستی اللہ کے قانونِ عذاب کی زد میں آ جاتی ہے۔ چنانچہ ہم اسے نیست و نابود کر دیتے ہیں!'' اور ''یقیناً محض نام و نمود اور نمائش کے لئے دولت کو اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں!'') ---- تاہم کوآپریٹو سکینڈلوں اور دیگر مالیاتی اداروں کی لوٹ کھسوٹ سے قطع نظر، مجموعی نسبت و تناسب کے اعتبار سے تاحال پاکستانی معاشرے میں سرمایہ دارانہ طرزِ استحصال کے مقابلے میں زمیندارانہ ظلم و جوز اور جاگیردارانہ زراعت اور مزارعت کے ''طریق واردات'' سے ہونے والے جبر و استحصال کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ یہاں کسی ''سماجی انصاف'' کا کوئی تصور تک نہیں کیا جا سکتا جب تک جاگیرداری اور زمین داری کے موجودہ نظام کو ختم کر کے ایک بالکل نئے اور منصفانہ بندوبست اراضی کی صورت پیدا نہ کی جائے۔ اس لئے کہ جب تک یہ نظام موجود ہے اور ستر پچھتر فیصد انسان جاگیرداروں، وڈیروں، بڑے زمین داروں اور قبائلی سرداروں کے زیر نگین ہیں دستورِ مملکت میں درج حقوق شہریت بالکل بے معنی ہیں (اسلئے کہ ان سے بالفعل صرف بڑے شہروں میں آباد اقل قلیل اقلیت ہی فائدہ اٹھا سکتی ہے!) اور نام نہاد بالغ رائے دہی کی اساس پر خواہ کتنے ہی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات کا ڈھونگ رچا لیا جائے ان پر مبنی جمہوریت فی الحقیقت جاگیرداروں کی آمریت کے سوا کچھ نہیں ہو گی!

چنانچہ یہ اسی عریاں حقیقت کا ادراک و اعتراف تھا جس کے نتیجے میں یہاں دو بار نام نہاد ''زرعی اصلاحات'' کا ڈول ڈالا گیا۔ لیکن چونکہ ''قوت کا اصل سرچشمہ'' جاگیردار ہی تھے، اور ظاہر ہے کہ ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اسی شاخ کو کاٹ ڈالیں گے جس پر ان کا اپنا آشیانہ اور ان کے مفادات و مراعات کا کامل دارومدار ہے، لہٰذا دونوں بار کی نام نہاد ''اصلاحات'' سنار کی کھٹ کھٹ سے زیادہ ثابت نہیں ہوئیں،

چنانچہ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ استحصالی نظام علیٰ حالہ اور جوں کا توں قائم ہے، جس کے نتیجے میں ع ''الیکشن، ممبری، کرسی، صدارت'' کا پورا سلسلہ صرف ایک سرمایہ دار خاندان کے علاوہ کلیتہً جاگیرداروں، وڈیروں اور قبائلی سرداروں کا میوزیکل چیئرز کا کھیل بنا ہوا ہے۔ اور اس کے باوجود کہ عوام کے ہاتھوں میں ''ووٹ'' نام کی ایک شے موجود ہے، درحقیقت اور فی الاصل ان کی حیثیت وہی ہے جو میر کے اس شعر میں بیان ہوئی کہ ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا!

پاکستان کی چھیالیس سالہ تاریخ کے دوران میں تین اشخاص ایسے برسرِاقتدار آئے جو اگر چاہتے تو پاکستانی معاشرے سے اس لعنت کا خاتمہ کر سکتے تھے، اس لئے کہ وہ فی الواقع اس پوزیشن میں تھے کہ اگر دل سے چاہتے تو ظلم و استحصال کے اس مکروہ ترین نظام کی جڑوں پر کاری وار کر کے سماجی انصاف کی راہ ہموار کر دیتے۔ ان میں سے دو تو فوجی حکمران تھے یعنی مرحوم صدر ایوب خان اور مرحوم صدر ضیاء الحق جن کے لئے اس میدان میں کوئی فیصلہ کن اقدام اس اعتبار سے بھی آسان تھا کہ فوجی حکمرانوں کے پاس اختیارات نہایت وسیع بلکہ بعض اوقات ''لامحدود'' ہوتے ہیں، اور ذاتی طور پر اس لئے مزید آسان تر تھا کہ وہ دونوں نہ جاگیردار تھے نہ بڑے زمین دار، اور تیسرے مرحوم ذوالفقار علی بھٹو تھے جو اگرچہ خود بڑے جاگیردار تھے لیکن ایک ایسی عوامی تحریک کے نتیجے میں برسرِاقتدار آئے تھے جو سوشلزم کے نعرے کی بنیاد پر چلائی گئی تھی۔ مزید برآں، ان کے اقتدار کا اصل دور بھی ''مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر'' ہی کی حیثیت سے شروع ہوا تھا۔ لیکن افسوس، صد افسوس کہ یہ تینوں اس معاملے میں کسی جرأت رندانہ سے کام نہیں لے سکتے۔

~~ان میں سے جہاں تک سابق صدر ایوب خان کا تعلق ہے، ان کے دور میں جو~~

زرعی اصلاحات ہوئیں ان کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ استحصال کو تو کوئی نمایاں ضعف نہیں پہنچا' البتہ ملک وقوم کی بہی خواہی میں انہوں نے معاشرے کو صنعتی ترقی کی جس راہ پر ڈال دیا چونکہ مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت ہی کی نقالی کی حیثیت رکھتی تھی لہٰذا اس سے جاگیردارانہ ظلم و جور پر مستزاد سود' جوئے اور سٹے پر مبنی سرمایہ دارانہ استحصال کا اضافہ ہو گیا۔

البتہ ایوب خان مرحوم کے مقابلے میں ضیاء الحق مرحوم کا معاملہ اس اعتبار سے زیادہ قابل افسوس ہے کہ انہوں نے تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے عروج کے موقع پر زمام حکومت ہاتھ میں لی تھی۔ چنانچہ اس وقت مسلمانان پاکستان کا دینی و مذہبی جذبہ تحریک پاکستان کے آخری ایام کے مقابلے میں بھی کہیں زیادہ قوی تھا۔ اس طرح گویا انہیں تاریخ نے ایک عظیم موقع عطا کیا تھا کہ اگر وہ چاہتے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ کے مقام اور مرتبے تک رسائی حاصل کر لیتے۔ اور یاد ہو گا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ نے' جنہیں پانچواں خلیفۂ راشد تسلیم کیا جاتا ہے' عنان خلافت ہاتھ میں لیتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ ان کے پیش رو حکمرانوں نے جو جاگیریں اپنے رشتہ داروں یا خدمت گاروں کو عطا کی تھیں ان سب کی دستاویزات منگوا کر پھاڑ ڈالیں اور اس طرح اس جاگیردارانہ نظام کی جڑیں ایک بار تو بالکل ہی کاٹ ڈالیں جو خلافت راشدہ کے اختتام کے بعد اس دور ملوکیت میں جڑ پکڑنے لگا تھا جسے نبی اکرم ﷺ نے ایک حدیث مبارک (احمد بن حنبلؒ عن نعمان ابن بشیرؓ) میں ''کاٹ کھانے والی'' یعنی ظالم و جابر حکومت سے تعبیر فرمایا ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ مرحوم جنرل ضیاء الحق پاکستان کے موجودہ جاگیردارانہ نظام کی جڑیں تو کیا کاٹتے' میری اس تجویز پر بھی عمل نہ کر سکے (جو میں نے ان کی مجلس شوریٰ میں پیش کی تھی) کہ جید علماء دین اور ماہرین بندوبست اراضی کا ایک کمیشن قائم کیا جائے جو پاکستان کے موجودہ نظام اراضی پر تنقیدی اور تحقیقی نظر ڈال کر شریعت اسلامی کے اصل مقاصد اور روح عصر کے اہم تقاضوں کو مدنظر

رکھتے ہوئے پاکستان کے لئے ایک ایسا ''نیا بندوبست اراضی'' تجویز کرے جس سے ملک وقوم کو سماجی انصاف سے ہمکنار کیا جا سکے!

اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو بھی تاریخ نے ایک عظیم موقع عطا فرمایا تھا کہ اگر وہ چاہتے تو پاکستان کے ماؤزے تنگ بن سکتے تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا کر عوام کو اپنے گرد جمع کیا تھا۔ اور اگرچہ مذہبی جماعتوں کی اکثریت نے ان کی مخالفت کی تھی، لیکن ایک اہم اور مؤثر ومنظم مذہبی جماعت یعنی جمعیت علماءِ اسلام نے ان کا ساتھ بھی دیا تھا۔ (واضح رہے کہ اُس وقت جمعیت علماء اسلام آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور اور نسبتاً زیادہ وسیع اور عمیق سیاسی اثر ورسوخ کی حامل تھی!) اور ان سطور کے حقیر و عاجز راقم نے بھی ''میثاق'' کے ادارتی صفحات میں ان لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے جو ''اسلامی جمہوریت'' کے تو دل و جان سے قائل ہی نہیں فدائی تھے لیکن ''اسلامی سوشلزم'' کو کفر قرار دیتے تھے، مفصل تحریریں شائع کی تھیں کہ اگرچہ اسلامی نظام بجائے خود ایک حیاتیاتی وحدت ہے جس میں کسی دوسرے ازم کی پیوند کاری نہیں ہوسکتی، چنانچہ اس کی اپنی جمہوریت اور شورائیت اور اسی طرح نظامِ عدل معاشی ہے، تاہم اگر اسلامی جمہوریت کی اصطلاح درست ہے تو یقیناً اسلامی سوشلزم کی اصطلاح بھی صحیح اور مطابق اسلام ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ ذوالفقار علی بھٹو بھی اپنی جاگیردارانہ کھال یا خول سے باہر نہ آ سکے۔ چنانچہ انہوں نے ملوں اور کارخانوں، یہاں تک کہ آٹے اور چاول کے چھوٹے چھوٹے صنعتی یونٹوں کو تو نیشنلائز کیا، لیکن زمین کو ''قومیانے'' کی ہمت نہ کر سکے جو ہماری قومی معیشت کی اصل اساس اور ہمارے معاشرے میں ظلم وجور اور جبر واستحصال کی سب سے بڑی بنیاد ہے!

بہرحال، پاکستان میں اسلام کے عطا کردہ نظامِ عدل اجتماعی کے قیام کے لئے شدید ضرورت ہے کہ پاکستانی معاشرے سے جبر، ظلم اور استحصال کی سب سے بڑی بنیاد کو منہدم کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا جائے.... اور جاگیرداری اور

زمینداری کے موجودہ نظام کا ایک جانب دین و شریعت کے بنیادی مقاصد اور اصل اہداف کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے کہ دین کے اعتبار سے حق و باطل اور شریعت اسلامی کی رو سے جائز و ناجائز میں صحیح امتیاز کیا جا سکے' اور دوسری جانب سماجی انصاف کے تقاضوں کے اعتبار سے بھی غور کیا جائے کہ کون سا راستہ عوام کی بہبود اور ملک و قوم کی خوشحالی' مضبوطی اور ترقی کے نقطۂ نگاہ سے صحیح اور مفید ہے اور کون سا غلط اور مضر.... اور پھر کیا عجب کہ ہمیں یہ دونوں تقاضے متحد اور یکجا نظر آئیں۔ اس لئے کہ اسلام دین فطرت ہے اور اگرچہ افراد کی سطح پر اس کے نزدیک اصل نصب العین اور مقصد اعلیٰ اللہ کی رضا اور اخروی فلاح ہے' لیکن دنیا میں اس کا اصل ہدف عدل و قسط کے نظام کا قیام ہے۔ (جس کی مفصل وضاحت صفحات گزشتہ میں ہو چکی ہے!)

اس ضمن میں ایک عملی مشکل دورِ ملوکیت میں پروان چڑھنے والی فقہ کے بعض فتاویٰ کی صورت میں بھی موجود ہے' جس کا ایک اہم مظہر سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ کے ایک فیصلہ کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ چنانچہ اس کے حل کے لئے بائیں بازو کے ہمارے بعض دانشور کبھی مارکس اور اینجلز کے ''عمرانی انکشافات'' کا سہارا لیتے ہیں (روس میں کمیونزم کی موت واقع ہو جانے کے بعد بھی ان حضرات کی یہ ''وفاداری بشرطِ استواری'' واقعتاً قابل داد ہے!) اور کبھی علامہ اقبال کے اشعار اور ڈاکٹر علی شریعتی کے افکار کا حوالہ دیتے ہیں' حالانکہ ؎

''خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی!''

کے مصداق اس کا کامل حل ''شمشیر قرآنی'' ہی کے حوالے سے دورِ خلافت راشدہ کے عہد فاروقیؓ کے ایک اجتہاد و اجماع میں موجود ہے' جس پر مفصل گفتگو ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں ہو گی۔

باب سوم

مسئلہ ملکیت زمین

یہ بات تو پاکستان کا ہر عاقل و بالغ شہری، اور ہر صاحب دانش و بینش انسان جانتا ہے کہ جب تک یہاں سے جاگیرداری اور بڑی زمینداری کا خاتمہ نہیں ہوتا نہ یہ ملک ترقی کر سکتا ہے، نہ یہاں عوامی فلاح و بہبود کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے، اور نہ ہی حقیقی معنی میں عوامی سیاست جڑ پکڑ سکتی ہے۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ جاگیرداروں سے ان کی جاگیریں اور بڑے زمینداروں سے ان کی فاضل زمینیں کس اصول کے تحت واپس لی جائیں؟ اس لئے کہ خواہ کسی اور معاملے میں یہاں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کا سوال نہ اٹھایا جاتا ہو، اور شریعت اسلامی کے اوامر و نواہی کو پوری شان استغناء کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا ہو، جب بھی جاگیرداری اور زمینداری کا مسئلہ سامنے آتا ہے فوراً شریعت کی ڈھال سامنے کر دی جاتی ہے اور اصول ملکیت اور اس کے جملہ لوازم کے ضمن میں اسلام کے خالص فقہی تصورات کی پناہ لے لی جاتی ہے۔

چنانچہ بعض لوگوں کو یہ تک کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ اصل میں پاکستان بنایا ہی نوابوں، وڈیروں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں نے تھا، اور ان کے پیش نظر قیام پاکستان سے صرف اپنے مفادات اور اپنی مراعات کے تحفظ کا مقصد تھا جو تا حال با حسن وجوہ پورا ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک جانب خود بھی عوامی جماعت تھی، اور دوسری جانب اس کی قیادت پر سوشلزم کے نظریات اور تصورات کا غلبہ تھا، جبکہ مسلم لیگ بنیادی طور پر نوابوں اور نواب زادوں اور ''سروں'' اور خان بہادروں کی جماعت تھی، جنہوں نے اسلام کے نعرے کو صرف اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر استعمال کیا۔ چنانچہ نتیجہ بھی عملی طور پر یہی نکلا کہ بھارت میں زمینداری آزادی

کے فوراً بعد ختم کردی گئی' جبکہ پاکستان میں فیوڈل لارڈز تاحال کوس لمن الملک بجارہے ہیں۔

تو اگرچہ ان لوگوں کا یہ نظریہ تاحال تو ''مطابق واقعہ'' ہونے کی بناء پر بظاہر بہت درست نظر آتا ہے' لیکن اس کی جڑ ایک تو اس حقیقت واقعی سے کٹ جاتی ہے کہ نہ مصور ومفکر و مجوز پاکستان علامہ اقبال جاگیردار یا زمیندار تھے' نہ ہی بانی و معمار و موسس پاکستان محمد علی جناح اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے' دوسرے ان شاء اللہ مستقبل ثابت کر دے گا کہ پاکستان کا قیام مشیت الٰہی میں پوری نوع انسانی کے سامنے اسلام کے سماجی انصاف' اور عدل وقسط پر مبنی اجتماعی نظام کا ایک نمونہ پیش کرنے کے لئے عمل میں آیا ہے' اور ان شاء اللہ جلد ہی اس ''راہی'' کو اپنی ''بھولی ہوئی منزل'' یاد آجائے گی اور یہ ''بھٹکا ہوا آہو'' بالآخر ''سوئے حرم'' روانہ ہوجائے گا! اللھم آمین!

تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ سوال جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے پہلے بھی محض خیالی یا وہمی نہیں تھا بلکہ واقعی اور حقیقی تھا' اور ۱۹۹۰ء میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپیلیٹ بینچ نے جو فیصلہ قزلباش وقف وغیرہ بنام چیف لینڈ کمشنر پنجاب وغیرہ نامی اپیل میں دیا تھا' اس نے تو اس سوال کو ہزار گنا زیادہ اہم بنا دیا ہے اور اگر اس مشکل کا کوئی حل تلاش نہیں کیا جاتا تو اس سے آئندہ کسی بھی نوعیت کی ادنیٰ سے ادنیٰ زرعی اصلاحات کا راستہ بھی ہمیشہ کے لئے مسدود ہوجائے گا۔

تو اگرچہ اس سوال کا جواب دینے اور اس مشکل کو حل کرنے کی اصل ذمہ داری سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے ان نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے انتخابی منشوروں میں زمین کی ملکیت کو محدود کردینا شامل کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ ان جماعتوں کی جانب سے تاحال اس سوال کا کوئی جواب اور اس مشکل کا کوئی حل پیش نہیں کیا گیا' جس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ اس معاملے میں ہرگز سنجیدہ نہیں ہیں' اور ان کے پیش نظر بھی سوائے سیاسی نعرہ بازی کے اور کچھ نہیں ہے!

واللہ اعلم۔

بنابریں راقم الحروف اس بحث کا آغاز اس لئے کر رہا ہے کہ اس پر سنجیدہ غور و فکر اور گفت و شنید کا آغاز ہو' اور خصوصاً وہ اہل علم اور رجال دین اس پر پوری توجہ مرکوز کریں جو اس ملک میں نہ صرف واقعی طور پر اسلام کی سربلندی اور دین حق کے غلبہ و قیام کے آرزو مند ہوں' بلکہ اس کے لئے اپنی ذہن و فکر اور سعی و عمل کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر بھی آمادہ ہوں! بالخصوص ایسے اصحاب علم و دانش آگے بڑھیں جو کتاب و سنت کے نصوص کی پابندی کے عزم مصمم کے ساتھ ساتھ صرف سلف کی اجتہادی آراء کے مقلد جامد بن کر نہ رہ جائیں بلکہ شریعت کے اصل مقاصد و اہداف کو بھی پیش نظر رکھ سکیں اور جہد و جہاد کے جذبے سے سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ قیاس و اجتہاد اور اس کے ضمن میں مصالح مرسلہ اور مفاد عامہ کو بھی ملحوظ رکھ سکیں۔ اس لئے کہ حکمت قرآنی کا جو اصل الاصول سورۃ الرعد کی آیت ۱۷ میں بیان ہوا ہے' اس کے مطابق دوام اور بقاء صرف ان ہی چیزوں کو حاصل ہوتا ہے "جو لوگوں کے لئے مفید ہوں!" اور اس کے بغیر تمام وعظ و نصیحت اور ساری سیاسی نعرہ بازی زبان کا پھاگ اور منہ کا جھاگ بن کر رہ جاتی ہے جس کا مقدر ہی "سوکھ کر ختم ہو جانا" ہے![1]

اس تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے اولین حقیقت جو پیش نظر رہنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ --- اگرچہ قانونی اور فقہی سطح پر اسلام میں انسانی ملکیت کا تصور یقیناً موجود ہے' چنانچہ اسی پر وراثت' زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ و نافلہ وغیرہ کے جملہ فقہی احکام مترتب ہوتے ہیں' تاہم واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی اساسی اور ایمانی تعلیمات کے مطابق یہ حق ملکیت اتنا مطلق' اتنا مقدس اور عرف عام میں اتنا "گاڑھا" نہیں ہے جتنا کہ سرمایہ دارانہ معیشت کے علمبردار خیال کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی اصل حیثیت صرف "حق و منع تصرف" کی ہے' یعنی کسی شے کے استعمال کا حق کسی ایک شخص معین کو حاصل ہو اور باقی سب کے لئے ممنوع ہو جائے!

چنانچہ قرآن حکیم کی اساسی تعلیمات کے مطابق کوئی انسان کسی دوسری شے تو کیا خود اپنے جسم و جان کا بھی مالک نہیں ہے' بلکہ اس کے وجود سمیت کائنات کی ہر شے کا مالک حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور جسم و جان' زمین و مکان' مال و منال اور آل و اولاد

[illegible]

فِیْ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا'' کہ ''ہم تصرف کریں اپنے اموال میں جیسے بھی ہم چاہیں!'' (ہود: ۸۷) بہرحال اسلام اس نوع کے مطلق اور مقدس حق ملکیت کا ہرگز قائل نہیں' اس کے نزدیک انسانوں کو جو حق ملکیت حاصل ہے وہ مقید اور محدود ہے۔

پھر خاص طور پر زمین کے ضمن میں یہ معاملہ ایک قدم مزید آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور --- اگرچہ ''اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ'' یعنی ''یقیناً زمین اللہ ہی کی ملکیت ہے!'' (الاعراف: ۱۲۸) اور ''وَالْاَرْضَ وَضَعَھَا لِلْاَنَامِ'' یعنی ''زمین کو اس نے بچھا دیا تمام مخلوقات کے لئے!'' (الرحمٰن: ۱۰) اور ''ھُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا'' یعنی ''وہی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے سب کچھ جو زمین میں ہے!'' (البقرۃ: ۲۹) اور اس مضمون کی دوسری بے شمار آیات سے زمین کی ذاتی ملکیت کے خلاف کوئی قانونی اور فقہی دلیل تو نہیں اخذ کی جاسکتی' تاہم ایک رہنما اصول ضرور حاصل ہوتا ہے جس کی نہایت

خوبصورت تعبیر کی ہے علامہ اقبال مرحوم نے، یعنی ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین

اور ؎

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آباء کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

اور ؎

رزق خود را از زمیں بردن روا ست!
ایں متاع بندہ و ملک خدا ست!

یہی وجہ ہے کہ زمین کے بارے میں یہ شرعی ضابطہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ اگر کسی قطعۂ زمین کا ''مالک'' اسے بے کار پڑا رہنے دے اور اس میں کاشت نہ کرے تو ایک معین عرصے کے بعد اس کا ''حق ملکیت'' خود بخود ختم ہو جائے گا اور زمین ضبط کر لی جائے گی۔

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر نہایت حسین و لطیف نکتہ وہ ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بیان فرمایا ہے کہ چونکہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''میرے لئے پوری زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے!''[۲] لہٰذا پوری زمین کو ''وقف'' کی حیثیت حاصل ہے، اس لئے کہ مسجد وقف ہوتی ہے۔ (چنانچہ جملہ اوقاف کے مانند مسجد کے بھی صرف ''متولی'' ہوتے ہیں، مالک کوئی نہیں ہوتا!)

تاہم ان تمام نکات سے صرف اصولی رہنمائی اخذ کی جا سکتی ہے، قطعی اور قانونی جزئیات کا استنباط نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ کم از کم ہم اہل پاکستان کی حد تک اس مشکل مسئلے کا مکمل حل امیر المومنین اور ''خلیفۃ خلیفہ الرسول ﷺ'' حضرت عمرؓ کے اس اجتہاد میں موجود ہے جو آپؓ نے عراق، شام، ایران اور مصر کے مفتوحہ ممالک کی اراضی کے

بارے میں کیا تھا اور جس پر ابتدائی ردوقدح اور بحث ونزاع کے بعد ''اجماع'' ہو گیا تھا اور جس کی بنیاد پر شریعت اسلامی میں اراضی کی دو مستقل قسمیں قرار پا گئیں' یعنی (۱) عشری جو انفرادی ملکیت میں ہوتی ہے اور جس کی پیداوار سے صرف عشر یعنی دسواں حصہ یا نصف عشر یعنی بیسواں حصہ بیت المال میں داخل ہوتا ہے۔ اور (۲) خراجی جو مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت یا بالفاظ دیگر بیت المال کی ملکیت ہوتی ہے اور جس کی پیداوار میں سے کم وبیش نصف کی حد تک ''خراج'' کی صورت میں بیت المال میں داخل ہوتا ہے۔

یہ واقعہ قاضی ابویوسفؒ نے اپنی مشہور زمانہ تالیف ''کتاب الخراج'' میں' جو انہوں نے عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش پر تالیف فرمائی تھی' نہایت عمدہ اور مفید تفاصیل کے ساتھ بیان فرمادیا ہے۔ ان مفتوحہ علاقوں کے بارے میں ایک رائے یہ تھی کہ ان کی تمام زمینیں' جملہ باشندوں سمیت ''مال غنیمت'' کی حیثیت رکھتی ہیں جنہیں اس قانون غنیمت کے مطابق جو سورۃ الانفال میں بیان ہوا ہے (آیت ۴۱) مجاہدین میں تقسیم کر دیا جانا چاہئے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کا صرف پانچواں حصہ بیت المال کی ملکیت قرار پاتا اور باقی چار حصے مجاہدین میں تقسیم ہو جاتے اور اس طرح تمام اراضی انفرادی جاگیریں بن جاتیں اور اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ تاریخ انسانی کا بدترین جاگیردارانہ نظام قائم ہو جاتا' بلکہ ان ممالک کے تمام باشندے مسلمانوں کے شخصی ''غلام'' بن جاتے۔ حضرت عمرؓ کے اس ذوق سلیم اور فہم عمیق نے اس صورت کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا' جس کی بناء پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ: ''حق عمرؓ کی زبان پر بولتا ہے!''[۳] اور ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے!''[۴] چنانچہ ان کے انقلابی واجتہادی مزاج اور عمیق اور مجتہدانہ فہم قرآن نے فیصلہ کیا کہ اموال غنیمت کا اطلاق صرف ان اموال منقولہ پر کیا جائے جو عین موقع جنگ پر حاصل ہوں' جیسے ہتھیار' سامان رسد اور گھوڑے اور اونٹ اور دوسرے مال مویشی وغیرہ جبکہ اراضی

اور دیگر اموال غیر منقولہ کو مال ''فے'' قرار دیا جائے جس کا حکم سورۃ الحشر کی آیات ۶ تا ۱۰ میں بیان ہوا ہے یعنی یہ سب مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار پائیں اور ان کی آمدنی عوام کی فلاح و بہبود پر بھی خرچ ہو اور دفاع ملی اور دیگر امور مملکت میں بھی صرف ہو۔ بہر صورت کسی کی بھی انفرادی ملکیت تصور نہ ہو۔

اس پر شدید رد و قدح اور بحث و نزاع کا بازار گرم ہو گیا۔ حضرت عمرؓ کی اس رائے سے اختلاف کرنے والوں میں ابتداءً حضرت بلالؓ اور ان کے بعض ساتھی تھے' لیکن پھر انہیں بعض کبار صحابہ رضی اللہ عنہم یہاں تک کہ عشرہ مبشرہ میں سے بھی دو حضرات یعنی حضرت زبیر بن العوام اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کی پرزور حمایت اور وکالت حاصل ہو گئی۔ جبکہ دوسری جانب بھی کبار صحابہؓ ہی کی ایک بڑی جماعت جس میں عشرہ مبشرہ سے بھی تین حضرات یعنی حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ اور ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے عالمان کتاب و سنت بھی شامل تھے' حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق رکھتی تھی۔ اور اس نزاع کا فیصلہ بالآخر اس طرح ہوا کہ انصار مدینہ میں سے اوس اور خزرج دونوں قبیلوں سے تعلق رکھنے والے پانچ پانچ اکابر صحابہؓ کی ایک مجلس تشکیل دی گئی جو زراعت کے معاملات میں واقفیت اور مہارت تامہ کے حامل تھے (گویا اصطلاح جدید میں زراعت اور بندوبست اراضی کے ماہرین کا ایک کمیشن مقرر کیا گیا) جنہوں نے ''بالاتفاق'' حضرت عمرؓ کی رائے کی تصویب کی۔ اور اس طرح گویا اس امر پر ''اجماع'' ہو گیا کہ جو ملک یا علاقے بزور شمشیر فتح ہوئے ہوں ان کی اراضی کسی کی ''انفرادی ملکیت'' نہیں ہوں گی' بلکہ بیت المال کی ملکیت یا بالفاظ دیگر مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار پائیں گی' جبکہ عشری یعنی انفرادی ملکیت میں داخل اراضی صرف ان علاقوں کی ہوں گی جہاں کے لوگ از خود لڑے بھڑے بغیر ایمان لے آئے ہوں' جیسے اہل یثرب جو از خود یا محض دعوت و تبلیغ سے ایمان لائے تھے' اور پھر خود جا کر نبی اکرم ﷺ کو اپنے یہاں لائے تھے۔ رضی

اللہ عنہم وارضاہم اجمعین۔

اس ضمن میں ''کتاب الخراج'' کا حسب ذیل اقتباس بہت مفید ہے جس میں حضرت عمرؓ اور اوس وخزرج کے مذکورہ بالا دس اکابر واشراف کی گفتگو نقل کی گئی ہے۔ و هو هذا!:

''جب یہ لوگ جمع ہو گئے تو آپؓ نے اللہ کی ایسی حمد وثنا کی جس کا وہ مستحق ہے' اور پھر فرمایا: ''میں نے آپ حضرات کو صرف اس لئے تکلیف دی ہے کہ میرے کاندھوں پر آپ کے معاملات کی ذمہ داری ہے' اس میں آپ میرا ہاتھ بٹائیں۔ کیونکہ میں بھی آپ کی طرح ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات کو حق متعین کرنا ہوگا۔ بعض لوگوں نے مجھ سے اختلاف کیا ہے اور بعض نے اتفاق۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ حضرات بہرحال وہی رائے قبول کریں جو میں نے اختیار کی ہے۔ آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے جو حق بات کہتی ہے۔ خدا کی قسم! اگر میں نے کوئی بات کہی ہے جس پر میں عمل کا ارادہ رکھتا ہوں تو اس سے میرا ارادہ سوائے اتباع حق کے کچھ اور نہیں۔''

ان لوگوں نے کہا:

''امیر المومنین! آپ فرمایئے' ہم سنیں گے (اور غور کریں گے)''

تو آپؓ نے فرمایا:

''آپ حضرات نے ان لوگوں کی باتیں سن لی ہیں جن کا خیال ہے کہ میں ان کی حق تلفی کر رہا ہوں۔ میں ظلم کے ارتکاب سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں' اگر میں نے کوئی ایسی چیز جو ان لوگوں کا حق تھی' ان کو نہ دی ہو اور دوسروں کو دی ہو' تو میں بڑا ہی بد بخت ہوں' لیکن میرا خیال ہے کہ کسریٰ کی سرزمین کے بعد اب کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے جو فتح ہو۔ اللہ نے ان کے اموال' زمینیں اور کاشتکار ہمیں بطور غنیمت عطا کر دیئے ہیں۔ ان لوگوں کو غنیمت سے جو مال ملا تھا اسے تو میں نے اس کے مستحقین میں تقسیم کر دیا ہے' اور پانچواں حصہ نکال کر اسے اس کے متعینہ مصارف میں تقسیم کر دیا ہے' بلکہ ابھی اس کی تقسیم میں مصروف ہوں۔ میں نے

یہ رائے قائم کی ہے کہ زمینوں کو مع کاشتکاروں کے سرکاری ملکیت قرار دے دوں اور اس کے کاشتکاروں پر خراج عائد کر دوں اور ان پر فی کس جزیہ مقرر کر دوں جسے وہ ادا کرتے رہیں۔ اس طرح یہ جزیہ اور خراج مسلمانوں کے لئے (ایک مستقل) ''فے'' کا کام کرے گا جس کی آمدنی میں فوجی، کم سن افراد اور آنے والی نسلیں حصہ دار ہوں گی۔ دیکھئے! ان سرحدوں کی حفاظت کے لئے بہرحال کچھ آدمی تعینات کرنے ہوں گے جو مستقلاً وہاں رہیں۔ یہ بڑے بڑے علاقے، جیسے شام، الجزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصران میں فوجی چھاؤنیاں قائم رکھنا اور ان کو وظائف دیتے رہنا ناگزیر ہے۔ اب اگر یہ زمینیں اور ان پر محنت کرنے والے کاشتکار تقسیم کر دیئے جائیں گے تو ان لوگوں کو کہاں سے دیا جائے گا؟''

یہ سن کر سب نے کہا:

''آپ ہی کی رائے صحیح ہے۔ آپ نے جو فرمایا، وہ خوب ہے، اور جو رائے قائم کی وہ بہت موزوں ہے۔ اگر ان شہروں اور سرحدوں میں افواج نہیں رکھی جائیں گی اور ان کے لئے بطور تنخواہ کچھ مقرر نہ کیا جائے گا تو اہل کفر اپنے شہروں پر پھر سے قابض ہو جائیں گے۔''

آخر میں آپؓ نے فرمایا: ''اب مجھ پر معاملہ واضح ہو گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ کون ایسا ماہر اور دانش مند ہے جو ان زمینوں کا مناسب طور پر بندوبست کر دے اور کاشت کاروں پر ان کی برداشت کے مطابق خراج تجویز کر دے؟''

لوگوں نے بالاتفاق عثمان بن حنیف کا نام پیش کیا اور کہا: ''آپ ان کو اس کام کا ذمہ دار بنا کر بھیج سکتے ہیں کیونکہ یہ صاحب فہم و بصیرت اور تجربہ کار انسان ہیں۔''

چنانچہ حضرت عمرؓ نے بلاتاخیر ان کو علاقہ سواد کی پیمائش کے کام پر مقرر کر دیا۔''

(''کتاب الخراج'' ترجمہ: ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی)

باب چہارم

خلافت' ملوکیت اور جاگیرداری

گزشتہ اوراق میں جو کچھ عرض کیا گیا' اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) اگرچہ انفرادی سطح پر جو بلند ترین نصب العین اسلام انسان کو عطا کرتا ہے وہ رضائے الٰہی اور فلاح اخروی کا حصول ہے' لیکن دنیا کی زندگی میں اجتماعی سطح پر اسلام کا بلند ترین مقصد یا ہدف' یا بالفاظ دیگر نصب العین سماجی انصاف اور نظام عدل اجتماعی کا قیام ہے!

(۲) سماجی انصاف کے ضمن میں اگرچہ اصولی طور پر معاشرتی سطح پر اولین اہمیت کامل انسانی مساوات اور باہمی اخوت کو حاصل ہے' اور سیاسی سطح پر یہی حیثیت حریت اور قانونی و دستوری برابری کو حاصل ہے' لیکن موجودہ دنیا میں سماجی انصاف کا اولین تقاضا جس پر باقی تمام امور کا کلی دارومدار ہے معاشی عدل اور کم از کم ''مواقع'' کے اعتبار سے کامل مساوات ہے!

(۳) اگرچہ عہد حاضر میں عالمی سطح پر تو معاشی ظلم اور استحصال کا سب سے بڑا ذریعہ سرمایہ دارانہ معیشت کا وہ عالمگیر نظام ہے جس کی اساس ''سرمایہ کے سود'' پر قائم ہے' لیکن پاکستان چونکہ بنیادی طور پر زرعی معیشت کا حامل ملک ہے' لہٰذا یہاں معاشی جبر و استبداد اور ظلم و استحصال کا سب سے بڑا مظہر ''زمین کے سود'' پر مبنی جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کا نظام ہے جس کی بیخ کنی کے بغیر یہاں سماجی انصاف کا کوئی تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) دور خلافت راشدہ کا سیاسی نظام چونکہ اللہ کی حاکمیت کے تحت اس کے فرمانبردار بندوں کی ''اجتماعی خلافت'' کا نظام تھا جس کی اصل اساس عدل و قسط پر قائم

تھی' لہٰذا اگرچہ اس کے دوران وہ نازک مرحلہ بھی آیا جس میں ذرا سی غفلت یا ڈھیل سے تاریخ انسانی کے عظیم ترین جاگیردارانہ نظام کی بنیاد قائم ہو جاتی لیکن ع ''اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار'' کے مصداق حضرت عمر فاروقؓ کی اجتہادی بصیرت نے تمام مفتوحہ ممالک کی کل اراضی کو خراجی یعنی تمام مسلمانوں کی ''اجتماعی ملکیت'' قرار دے کر اس کا کامل سد باب کر دیا۔

لیکن افسوس کہ جیسے ہی خلافت راشدہ کا دور ختم ہوا' اور خلافت نے تدریجاً ملوکیت کی صورت اختیار کرنی شروع کی اس معاملے میں بھی زوال کا آغاز ہو گیا اور جو دروازہ حضرت عمرؓ نے اپنی اجتہادی بصیرت اور بے مثال ہمت و جرأت سے بند کیا تھا' آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں جاگیرداری اور غیر حاضری زمینداری نے عالم اسلام میں قدم جمانے شروع کر دیئے۔

یہاں یہ عرض کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ جاگیرداری اور ملوکیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے' اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہو گا کہ جیسے بعض حشرات الارض (مثلاً کن کھجورا) کے سینکڑوں پاؤں ہوتے ہیں ایسے ہی جاگیردار اور ''لینڈ لارڈز'' ملوکیت' شہنشاہیت اور ''امپیریلزم'' کے پاؤں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلکہ غالباً اس سے بھی صحیح تر مثال برگد کے درخت کی اضافی جڑوں کی ہے کہ جیسے جیسے اس کا پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے اس کی شاخوں سے انسانی داڑھی کے سے انداز میں اضافی جڑیں نیچے اترنی شروع ہو جاتی ہیں جو زمین تک پہنچ کر اور اس میں قدم جما کر نہ صرف اضافی جڑوں کا کام دیتی ہیں جن سے زمین کی غذائیت درخت کو حاصل ہوتی ہے بلکہ ستونوں کی صورت اختیار کر کے اضافی سہارا بھی بن جاتی ہیں۔ بعینہ یہی معاملہ ملوکیت اور شہنشاہیت کا ہے کہ یہ جیسے جیسے پھلنی اور پھیلنی شروع ہوتی ہے اپنے وفاداروں اور خدمت گزاروں کو جاگیرداری کی مسندیں اور منصب عطا کر کے انہیں کاشتکاروں کے استحصال کے ذریعے اپنے اقتدار کے سہاروں کی حیثیت دے دیتی ہے۔

چنانچہ یہی حادثہ خلافت راشدہ کے خاتمے کے بعد عالم اسلام کو پیش آیا۔ حضرت سفینہؓ سے نبی اکرم ﷺ کا ایک قول مبارک امام احمدؒ امام ترمذیؒ اور امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے کہ: ''خلافت تیس برس تک رہے گی' اس کے بعد ملوکیت کا آغاز ہو جائے گا۔'' اور امام احمدؒ نے آنحضور ﷺ کی ایک اور حدیث جو حضرت نعمان ابن بشیرؓ سے روایت کی ہے' اس میں آپ ﷺ نے اس ملوکیت کے ساتھ ''کاٹ کھانے والی'' یعنی ظالم اور غاصب کی صفت کا اضافہ فرمایا ہے۔ تو اگرچہ تاریخ اسلام میں خلافت کے پورے طور پر ملوکیت میں تبدیل ہونے میں تو لگ بھگ ایک صدی کا عرصہ لگا اس لئے کہ ملوکیت کے اصل ٹھاٹھ باٹھ پورے طور پر بنو عباسؓ کے دور میں شروع ہوئے تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کے آثار امیر معاویہؓ کے عہد حکومت ہی میں شروع ہو گئے تھے۔ اس کے نتیجے میں اسلام کی تعلیمات کے ایک حصے پر پردے پڑنے کے اس عمل کا آغاز ہو گیا تھا جس کا تذکرہ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد میں ان الفاظ میں کیا تھا کہ: ''میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ تقدیر مبرم ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہو گی۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کے چہرے پر جو پردے عرب امپیریلزم کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اسلام کی اصل تعلیمات کی ایک عملی صورت دنیا کو دکھا سکیں!''

واضح رہے کہ امیر معاویہؓ ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ اور خواہ اسے ۔

''مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا!''

کے مصداق ہی قرار دیا جائے' بہر حال میری سوچی سمجھی اور پختہ رائے یہ ہے کہ ان کی نیت پر شک کرنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر اپنے ایمان کو مشکوک بنانے کے مترادف ہے' اس لئے کہ اگرچہ وہ فتح مکہ کے دن ایمان لائے تھے تاہم اس کے

بعد پورے ڈھائی سال تک نہ صرف یہ کہ آنحضور ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے بلکہ ''کاتب وحی'' کی اہم اور نازک ذمہ داری تک کے اہل قرار پائے۔ بنابریں یہ گمان کہ ان کا تزکیہ نفس اور تصحیح نیت نہیں ہو پائی تھی مزکیٔ اعظم ﷺ پر طعن کی حیثیت رکھتا ہے... تاہم دوسری جانب اس حقیقت سے صرف نظر بھی نہ حقائق و واقعات کے اعتبار سے ممکن ہے' نہ نصوص حدیث نبوی ﷺ کی رو سے درست ہے' کہ ان کا دور حکومت دور خلافت راشدہ میں شامل نہیں ہے۔ اور خواہ یہ خالص ''حالات کے جبر'' اور مصالح امت ہی کے تقاضوں کے تحت ہوا ہو' بہرحال واقعہ یہی ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے ایک حصے کے پردے کے پیچھے چھپ جانے یا بالفاظ دیگر اس سورج کو گہن لگ جانے کا عمل ان ہی کے دور حکومت سے شروع ہو گیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت حضرت ابوہریرہ کا یہ قول ہے جسے امام بخاریؒ نے ''کتاب العلم'' میں روایت کیا ہے کہ:

''حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وِ عَائَیْنِ فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ فِیْكُمْ وَاَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ''

''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے (علم کے) دو برتن حاصل کئے۔ تو ان میں سے ایک کو تو میں نے تمہارے مابین خوب عام کر دیا ہے' لیکن اگر دوسرے کو عام کر دوں تو میری گردن کاٹ دی جائے گی!''

(واضح رہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی وفات ۵۷ھ یا ۵۸ھ یا زیادہ سے زیادہ ۵۹ھ میں گویا حضرت معاویہؓ کی وفات سے ایک سال قبل ہو گئی تھی۔) تو اگرچہ اس قول میں یہ صراحت نہیں ہے کہ وہ دو برتن کون سے ہیں' تاہم یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جس علم کے عام کئے جانے سے کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا تھا لہٰذا اس کے عام کرنے والے کو بھی کوئی اندیشہ لاحق نہیں ہو سکتا تھا وہ نماز' روزہ' زکوۃ اور حج' یعنی عبادات کے مسائل یا نکاح و طلاق وغیرہ کے مسائل کا علم... اور جس علم سے مراعات

یافتہ طبقات کے مفادات پر آنچ آ سکتی تھی' چنانچہ اس کے عام کرنے والے کی ذات کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا' وہ تھا نظام حکومت اور عمال حکومت' اور زمینداری اور جاگیرداری سے متعلق اصولی اور تفصیلی ہدایات کا علم!

قصہ مختصر' جیسے ہی عالم اسلام میں ملوکیت نے جڑیں جمانی شروع کیں جاگیرداری کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اور حضرت معاویہؓ کے انتقال کے چالیس سالوں کے دوران اس خباثت نے اپنی جڑیں جتنی کچھ پھیلا لی ہوں گی اس کا اندازہ ہرگز مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث مبارک کے مطابق کہ:

اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا

''یقیناً اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے اولوالعزم لوگوں کو کھڑا کرتا رہے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو از سر نو تازہ کر دیں گے!''

پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری صدی کے آغاز پر جو مجدد اول (اور تا حال اعظم بھی' اس لئے کہ وہ واحد مجدد تھے جو صاحب اختیار و اقتدار بھی تھے اور جن کے ذریعے صرف علمی و فکری تجدید اور عقائد و اخلاق کی اصلاح نہیں بلکہ نظامِ حکومت کی اصلاح ہوئی!) یعنی حضرت عمرؓ کی پوتی کے صاحبزادے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) ''مبعوث'' ہوئے' تو انہوں نے جہاں ایک جانب اپنی ''نامزدگی'' سے اظہار براءت کیا اور منصب حکومت صرف اس وقت اختیار کیا جب لوگوں نے کہا کہ ہم اپنی آزادانہ مرضی سے آپ کی خلافت قبول کرتے ہیں' وہاں دوسری جانب جو اہم ترین تجدیدی کارنامہ سرانجام دیا وہ یہی تھا کہ جاگیروں کے وثیقے اور دستاویزات منگوا کر چاک کر دیں اور اس طرح کم از کم ایک بار تو پھر نظام اسلام کو ''زمین کے سود'' سے پاک کر دیا۔

محترم صاحبزادہ عبدالرسول صاحب نے اپنی تالیف ''تاریخ اسلام'' میں اس سلسلہ میں ایک مکالمہ نقل کیا ہے کہ: ''یہ حالت دیکھ کر بنو امیہ سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے

ہشام (بن عبدالملک جو خود بھی چند سال بعد حکمران بنا) کو اپنا نمائندہ بنا کر آپؒ کے پاس بھیجا۔ اس نے آپؒ سے کہا کہ آپ اپنے عہد میں جو چاہیں کریں لیکن جو کام پچھلے خلفاء کر گئے ہیں انہیں اپنی حالت میں رہنے دیں۔ آپؒ نے جواب دیا کہ اگر ایک ہی معاملے میں تمہارے سامنے دو دستاویزات ہوں' ایک امیر معاویہؓ کی اور دوسری عبدالملک کی' تو تم کس پر عمل کرو گے؟ اس نے کہا قدیم دستاویز پر! اس پر آپ نے فرمایا کہ "میرے پاس قدیم دستاویز کتاب اللہ ہے' میں اس پر عمل پیرا ہوں!"...اور ظاہر ہے کہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا تھا جس کی رگوں میں' خواہ صرف والدہ ماجدہ ہی کی جانب سے سہی' کسی نہ کسی درجے میں عمر فاروقؓ کا خون بھی دوڑ رہا تھا۔

تاہم حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کا عہد خلافت ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود!" کی مثال تھا۔ ان کو زہر دے کر شہید کرنے کے بعد' بنو امیہ کے بقیہ تیس سالہ دور حکومت اور اس کے بعد دولت بنی عباسؓ کے دوران "عرب امپیریلزم" کے سائے میں جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کا شجر خبیثہ خوب پھلا پھولا۔ اور اگرچہ فقہ اسلامی کے دونوں سلسلوں یعنی اصحاب حدیث اور اصحاب رائے و قیاس کے "امامین اولین" یعنی امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام دار الہجرت مالک بن انسؒ نے "مزارعت" کو حرام مطلق قرار دے کر اس شجرۂ خبیثہ کی جڑ پر بھرپور تیشہ چلایا اور کاری وار کیا' اور اس کے نتیجے میں قید و بند اور زدوکوب کی صعوبتیں برداشت کیں' لیکن جیسے جیسے ملوکیت اور جاگیرداری کی جڑیں زمین میں گہری اترتی گئیں حالات کے جبر اور "نظریۂ ضرورت" کے عمل دخل کا ظہور ہوا اور امام ابوحنیفہ کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسفؒ نے جہاں "قاضی القضاۃ" کا وہ عہدہ بھی قبول فرما لیا جس کو قبول کرنے سے ان کے مربی اور استاذؒ نے سختی کے ساتھ انکار کر کے تشدد و تعذیب کو دعوت دی تھی' وہاں انہوں نے امام صاحب کے دوسرے شاگرد امام محمدؒ کے اتفاق رائے کے ساتھ مزارعت پر کچھ شرائط عائد کر کے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ بھی دے دیا... بعد میں وہ شرائط تو طاق نسیاں

کے حوالے ہوگئیں اور پورے عالم اسلام میں ''مزارعت'' شیر مادر کی مانند حلال وطیب ہوگئی اور اس طرح شہنشاہیت اور جاگیرداری کو دوام واستحکام حاصل ہوگیا! (کچھ ایسا ہی معاملہ فقہ اسلامی کی دوسری عظیم شاخ یعنی اصحاب حدیث کے ساتھ بھی پیش آیا۔ یعنی امام مالکؒ کے شاگرد امام شافعیؒ نے تو کھلے کھیت میں مزارعت کی حرمت کے فتوے کو برقرار رکھتے ہوئے صرف باغ کے تابع کھیت میں اس کے جواز کا فتویٰ دیا تھا' لیکن ان کے بعد امام احمدؒ اور امام بخاریؒ وغیرہم نے اسے بالعموم جائز قرار دے دیا! گویا ع ''متفق گردید رائے بوعلی با رائے من'' کے مصداق کم از کم جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کے معاملے میں یہ دونوں متحارب سلسلہ ہائے فقہ متفق ہوگئے۔)

کچھ اسی قسم کا معاملہ بزور شمشیر فتح ہونے والے علاقوں کی اراضی کو ''بیت المال کی ملکیت'' میں برقرار رکھ کر ان سے حاصل شدہ خراج کو دفاع اور دیگر انتظامی ضروریات اور سب سے بڑھ کر عامۃ المسلمین اور عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے وقف رکھنے کی بجائے منظور نظر اشخاص وافراد کو جاگیروں کی صورت میں دے کر ان کی ذاتی ملکیت قرار دینے کے معاملے میں ہوا۔ جس کے لئے دلیل نبی اکرم ﷺ کے اس معاملے سے لائی گئی جو آپؐ نے ۷ھ میں فتح خیبر کے بعد وہاں کے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا۔ حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو اجتہاد اپنے دور خلافت میں کیا' وہ فتح خیبر کے کم وبیش دس سال بعد کا واقعہ ہے۔ اور جبکہ یہ معلوم ہے کہ ان کی رائے پر ردوقدح اور بحث ونزاع کا بازار پوری طرح گرم رہا تھا' جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے' تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ جو حضرات مفتوحہ اراضی کو مال غنیمت کے طور پر تقسیم کرنے کے حق میں تھے انہوں نے آنحضور ﷺ کے معاملۂ خیبر کو دلیل کے طور پر پیش نہ کیا ہو۔ اور اگرچہ ہمارے پاس اس ردوقدح اور بحث و نزاع کا کوئی مفصل ریکارڈ محفوظ نہیں ہے' تاہم یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ اس دلیل کا رد یقیناً کسی زیادہ وزنی دلیل ہی سے کیا گیا ہوگا۔ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضور

ﷺ کے انتقال کے صرف چند سال بعد دورِ خلافت راشدہ ہی میں آپ ﷺ کے طرزِ عمل کے برعکس معاملے پر اتفاق ہو جاتا۔ رہی یہ بات کہ وہ دلیل کیا تھی تو قرائن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد اسی امر واقعی پر ہوگی کہ خیبر کا معاملہ سود کی آخری اور قطعی حرمت والی آیات کے نزول سے لگ بھگ اڑھائی سال قبل کا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حرمت ربٰوا کے حکم نے جملہ مالی معاملات اور اقتصادی امور کے ضمن میں صورت حال کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ متعدد احادیث اس پر گواہ ہیں کہ آپ ﷺ نے مزارعت کے معاملے کو بھی ''ربوا'' قرار دیا۔ اور چونکہ ان آیات مبارکہ کے نزول کے بعد نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دنیوی بہت مختصر رہی لہٰذا حرمتِ ربوا کی زد کن کن معاملات پر پڑتی ہے اس کی پوری تفصیل صحابہ کرامؓ پر واضح نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ:

''اِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَتْ آيَةُ الرِّبَا' وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قُبِضَ وَ لَمْ يُفَسِّرْ هَا لَنَا' فَدَعُو الرِّبَا وَ الرِّيْبَةَ''

''قرآن میں جو آیات بالکل آخر میں نازل ہوئیں ان میں آیت ربا بھی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو گیا جب کہ ابھی آپ ﷺ نے اس آیت کی پوری تفسیر ہمیں نہیں سمجھائی تھی۔ پس نہ صرف ربا کو ترک کر دو' بلکہ جس معاملے میں ربا کا شک اور شائبہ بھی پیدا ہو جائے اسے بھی ترک کر دو!''

بہر حال یہ ہے وہ تاریخی پس منظر جس میں دورِ ملوکیت میں مرتب ہونے والی فقہ کے مالی اور معاشی مسائل میں ایک جانب بیع مؤجل اور بیع مرابحہ کے جواز کے راستے سے ''سرمایہ کا سود'' تو دبے پاؤں بالکل غیر محسوس انداز میں داخل ہو گیا (بیع مؤجل اور بیع مرابحہ پر ان شاء اللہ آئندہ کبھی تفصیلی گفتگو ہو گی) رہا ''زمین کا سود'' تو وہ تو حسب ذیل فتوے کی رو سے پورے دھڑلے کے ساتھ پورے عالم اسلام میں رائج ہو گیا کہ ''پس حکمران کو اختیار ہے کہ چاہے تو مفتوحہ اراضی کو مالِ غنیمت کے طور پر فاتحین میں تقسیم کر دے جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے خیبر کے معاملے میں کیا تھا یا چاہے تو

وہ معاملہ کرے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوادِ عراق کے ضمن میں کیا تھا'' (المبسوط)
اس لئے کہ اس فتوے کے ذریعے جاگیرداری جائز ہوگئی جس کا سارا دارومدار ہی مزارعت پر ہے' جو زمین کے ربا کی حیثیت رکھتی ہے۔

اوپر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا جو قول ''علم کے دو برتنوں'' کے ضمن میں نقل ہوا ہے اس کی حقیقت مزید اجاگر ہو جائے گی اگر یہ بات پیش نظر رہے کہ ایک مجلس کی تین یا تین سے بھی زائد طلاقوں کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ جو ایک رعایت اور نرمی فرمایا کرتے تھے اسے حضرت عمرؓ نے مصلحت امت کے پیش نظر اپنے ایک اجتہادی فیصلہ سے ختم کر دیا تو اس پر تو اہل سنت کے چاروں مکاتب فقہ کا اس درجہ عزم بالجزم کے ساتھ اصرار ہے کہ کسی بھی صورت میں نبی اکرم ﷺ کی رعایت کو دوبارہ جاری کرنے پر آمادہ نہیں ہیں' لیکن جاگیرداری اور زمینداری کے مسئلے میں حضرت عمرؓ کے اجتہاد اور اس پر اس وقت کے ''اجماع'' کو رد کر کے حضور ﷺ کے معاملۂ خیبر پر عمل کرنے کے اختیار کو حاکم وقت کے لئے تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر ''اجماع'' کوئی خالص تصوراتی بلکہ وہمی شے نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی واقعی وجود ممکن ہے تو وہ یا تو صرف دورِ خلافت راشدہ کا اجماع ہی ہو سکتا تھا جب پورا عالم اسلام ایک سیاسی وحدت تھا' یا پھر قیامت کے قریب اس وقت ممکن ہوگا جب آنحضور ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق تمام روئے ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوت یعنی اسلام کے ''جسٹ ورلڈ آرڈر'' کا نظام قائم ہو جائے گا۔

تاہم میری ان معروضات کو نہ مفتیان کرام کی توہین پر محمول کیا جائے' نہ فقہائے عظام کی تنقیص پر' بلکہ جیسے کہ سطور گزشتہ میں عرض کیا گیا تھا' مقصود صرف یہ ہے کہ ان مسائل پر بحث و گفتگو کا آغاز ہو۔ اور مصالح مرسلہ اور مفادعامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے افہام و تفہیم کے ذریعے آئندہ کے لئے راہیں متعین کی جائیں۔

البتہ یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ اگر اس دور میں جبکہ ابھی ملوکیت بھی جڑیں

پکڑ ہی رہی تھی' اور ''کسرائے عرب'' یا ''کسرائے اسلام'' بھی ایک جلیل القدر صحابی (حضرت معاویہؓ) تھے' ایک دوسرے جلیل القدر صحابی (حضرت ابو ہریرہؓ) کو اپنی اس بشری کمزوری کے اعتراف میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل شدہ علم کے ایک برتن کا منہ جان کے خوف سے بند کر رکھا ہے' تو اس کے سو ڈیڑھ سو برس بعد جبکہ ملوکیت بھی اپنی پوری شان اور کروفر کے ساتھ جلوہ گر ہو چکی تھی' اور ''قرون مشهود لها بالخیر'' (یعنی وہ ادوار جن کے خیر کے حامل ہونے کی گواہی خود آنحضور ﷺ نے دی ہے) کا زمانہ بھی بیت چکا تھا' علمائے اسلام اور فقہائے کرام کا حالات کے جبر سے متاثر ہو جانا ہرگز نہ بعید از قیاس ہے نہ ان کے لئے موجب توہین!

بہر حال' جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کے ظالمانہ اور استحصالی نظام سے نجات پانے کی واحد شرعی راہ یہ ہے کہ شمشیر فاروقیؓ کو بے نیام کیا جائے۔ اور حضرت عمرؓ کے اجتہاد کے مطابق (جس پر کم از کم اس وقت اجماع بھی ہو گیا تھا) تمام مفتوحہ ممالک کی اراضی کو ''خراجی'' یعنی بیت المال یا مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا جائے جو کسی کی انفرادی ملکیت میں ہیں ہی نہیں کہ وہ سارے مسائل پیدا ہوں جو سپریم کورٹ کے شریعت ایپلیٹ بنچ کے فاضل جج صاحبان نے اپنے فاضلانہ فیصلوں میں اٹھائے ہیں۔ بنابریں اب تک مسلمان حکمرانوں یا غیر مسلم حاکموں نے جن جن لوگوں کو جاگیریں عطا کی تھی ان سے جو استفادہ وہ اب تک کر چکے ہیں اس کو ''فَلَهُ مَا سَلَفَ'' (البقرہ:۲۷۵) کا مصداق قرار دے کر (یعنی: جو گزر چکا وہ ان کو معاف ہے!) آئندہ ایک ایسے نئے بندوبست اراضی کا اہتمام کیا جائے جس سے سماجی انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوں' عوام کی عظیم اکثریت کی معاشی حالت بھی بہتر ہو' زمین کی پیداوار میں بھی اضافہ ہو' اور قوم اور ملک کو بھی استحکام حاصل ہو۔ اس ضمن میں دو باتیں مزید انشراح کا ذریعہ بن سکتی ہیں:

(۱) ایک یہ کہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک جو مما لک خلافت عثمانیہ کے زیر نگیں تھے‘ ان میں یہی بندوبست اراضی رائج تھا کہ تمام اراضی سرکاری ملکیت میں تھیں اور کاشتکاری بھی ”موروثی مزارعت“ کی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ ایک کاشتکار کے انتقال کے بعد اس کے وارثوں کو از سر نو پروانۂ کاشتکاری حاصل کرنا ہوتا تھا۔

(۲) دوسرے یہ کہ ہندوستان کے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے نامور شیخ اور عظیم ترین مفسر‘ محدث اور فقیہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (صاحب تفسیر مظہریؒ) نے اپنی مشہور زمانہ تالیف ”ما لا بد منہ“ میں صاف تحریر فرمایا ہے کہ ”چونکہ اس ملک میں زمینیں عشری نہیں (بلکہ خراجی) ہیں‘ لہٰذا اس کتاب میں عشر اور عاشر (یعنی عشر وصول کرنے والے تحصیل داروں) کے احکام بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!“

واضح رہے کہ یہ کتاب فقہ حنفی کے قاعدے یا پرائمر کی حیثیت سے تمام مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے۔

آخر میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت بینچ کے متذکرہ بالا فیصلے پر جو فاضلانہ تبصرہ ملک کے ایک ماہر قانون دان جناب سردار شیر عالم صاحب نے کیا ہے‘ جو پاکستان لاء جرنل کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۹۳ء میں ”قرارداد مقاصد اور عدلیہ کا کردار!“ کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس کے حسب ذیل دو افتتاحی اور اختتامی جملے ہدیۂ قارئین ہیں:

(1) "In Qazilbash Waqf case, the Land Regulation of 1972 and Land Reforms Act of 1977 which fixed the ceiling for land holding were struck down on the basis of repugnency of Islam. The court broke through the protective stonewall erected by Articales 253, 8(3), (24), 268 (2), 269 and reinforced by Article 203B (c) of the Constitution."

(2) "Now the situation is that the judicial pronouncement of the Supreme Court has struck down the land reforms as un-Islamic and thus defeated the operation of so many constitutional provisions including 253 (2).

But it remains an open question even now as to which one should prevail, the effect of a constitutional provision i.e. 253(2) or the effect of judicial pronouncement."

کاش کہ سپریم کورٹ آف پاکستان اپنے اس فیصلے پر از خود نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کرے۔ اللھم آمین!

حواشی

۱) فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ

الخراج والامارة

۴) عن عقبة بن عامر رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول : ((لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ......)) رواہ الترمذی ' باب مناقب عمر بن الخطاب

۵) عن سعید بن جمہان قال حدثنی سفینة (رضی اللّٰہ عنہ) قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : ((اَلْخِلَافَةُ فِيْ أُمَّتِيْ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً ثُمَّ مُلْكٌ بَعْدَ ذٰلِكَ ......)) ثم قال لی سفینة : اَمْسِكْ خلافة ابی بکر ' ثم قال وخلافة عمر و خلافة عثمان' ثم قال امسک خلافة علی فوجدناھا ثلاثین سنة ......رواہ الترمذی فی الفتن ' باب ماجاء فی الخلافة ......ورواہ ابو داود فی السنة ' باب فی الخلفاء.

۶) حدیث کے الفاظ ہیں: ((......ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًا......))

۷) عن ابی ھریرة رضی اللّٰہ عنہ اخرجہ ابو داود فی الملاحم ' باب ما یذکر فی قرن المائة ' واسنادہ صحیح ' ورواہ ایضاً الحاکم وصححہ ووافقہ الذھبی

۸) عن سعید بن المسیب رواہ ابن ماجہ فی التجارات ' باب التغلیظ فی الربا' واسنادہ صحیح

مرکزی **انجمن خدام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ